# عرفان صدیقی کی شاعری میں غمِ جاناں
## (شعری مجموعہ ''عشق نامہ'' کے حوالے سے)

محمد فیروز خان، ریسرچ اسکالر
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ملخص

عرفان صدیقی کا اصل نام محمد عرفان اور قلمی نام عرفان صدیقی ہے ۔ ان کی پیدائش ہندوستان کے قدیم شہر بدایوں میں 11 مارچ 1939، اور وفات 15/اپریل 2004 کو لکھنؤ میں ہوئی۔عرفان صدیقی اسکول ہی کے زمانے سے تقریری وتحریری مقابلوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ ان کا پہلا مضمون ''چندر بردائی کی رزمیہ نظم'' پرتھوی راج راسو میں عربی فارسی الفاظ 1954 میں رسالہ'' آج کل'' میں شائع ہوا۔' آج کل' جیسے معیاری رسالے میں مضمون کی اشاعت ان کے مستقبل میں کامیاب ادیب بننے کی ضمانت ہے۔ میٹرک کے زمانے میں شاعری میں دلچسپی لینے لگے اور یہ سلسلہ تاحیات جاری رہا۔وہ پیشے کے اعتبار سے آفیسر تھے۔لیکن قدرتی طور پر ان کی تخلیق ایک شاعر کی حیثیت سے ہوئی تھی اور ساتھ ہی ساتھ مختلف علوم وفنون سے وابستگی نے اس میں چار چاند لگا دیا۔ان کی ادبی کاوشوں کی فہرست بہت لمبی ہے، وہ نہ صرف ایک شاعر بلکہ ایک اچھے نثر نگار اور مترجم بھی تھے۔اس سلسلے میں ''رتو سمہارام'' کا ترجمہ رت سنگھار، محمد عسکری کی سوانحی ناول کا ترجمہ ''روٹی کی خاطر''، آر۔کے۔چٹرجی کی انگریزی تصنیف ''ماس کمیونیکیشن'' کا ترجمہ عوامی ترسیل کے نام سے کیا، رابطۂ عامہ کے موضوع پر کتاب لکھی، ساہتیہ اکادمی کے لیے انگریزی میں اردو ادب کا جامع انتخاب (1850-1100) کیا اور ریڈیو ٹیلی ویژن کے لیے مختلف

موضوعات پر فیچرس لکھے، جس نے ان کی شخصیت کو دوام بخشا۔

عرفان صدیقی کا اصل نام محمد عرفان اور قلمی نام عرفان صدیقی ہے۔ان کی پیدائش ہندوستان کے قدیم شہر بدایوں میں 11 مارچ 1939 میں ہوئی۔عرفان صدیقی کے والد مولوی سلمان احمد ہلالی بدایوں میں ایڈوکیٹ تھے اور دیوانی معاملات میں خصوصی ماہرین میں شمار کیے جاتے تھے۔

عرفان صدیقی نے جس ماحول اور جس فضا میں ہوش سنبھالا اس میں ہر طرف علم و ادب خصوصاً شاعری کا چرچا تھا۔اور قدیم ثقافت کے نمائندہ افراد ان کے اپنے گھر میں موجود تھے۔عرفان صدیقی اسکول ہی کے زمانے سے تقریری وتحریری مقابلوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔اور ہمیشہ امتیازی مقام حاصل کرتے تھے۔ان کا پہلا مضمون ''چندر بردائی کی رزمیہ نظم'' پرتھوی راج راسو میں عربی فارسی الفاظ 1954 میں رسالہ'' آج کل'' میں شائع ہوا۔'آج کل' جیسے معیاری رسالے میں مضمون کی اشاعت ان کے مستقبل میں کامیاب ادیب بننے کی ضمانت ہے۔ میٹرک کے زمانے میں شاعری میں دلچسپی لینے لگے اور یہ سلسلہ تاحیات جاری رہا۔

حیرت کی بات ہے کہ اردو ادب سے بالواسطہ طور پر وابستگی کے باوجود ان کی شاعری میں جس طرح کی گہرائی و گیرائی ملتی ہے اسے ہم خداداد صلاحیت کے علاوہ کوئی اور نام نہیں دے سکتے۔وہ پیشے کے اعتبار سے آفیسر تھے۔لیکن قدرتی طور پر ان کی تخلیق ایک شاعر کی حیثیت سے ہوئی تھی اور ساتھ ہی ساتھ مختلف علوم وفنون سے وابستگی نے اس میں چار چاند لگا دیا۔ان کی ادبی کاوشوں کی فہرست بہت لمبی ہے، وہ نہ صرف ایک شاعر بلکہ ایک اچھے نثر نگار اور مترجم بھی تھے۔اس سلسلے میں ''رتو سمہارام'' کا ترجمہ رت سنگھار، محمد عسکری کی سوانحی ناول کا ترجمہ ''روٹی کی خاطر''، آر۔کے۔چڑجی کی انگریزی تصنیف ''ماس کمیونیکیشن'' کا ترجمہ عوامی ترسیل کے نام سے کیا، رابطۂ عامہ کے موضوع پر کتاب لکھی، ساہتیہ اکادمی کے لیے انگریزی میں اردو ادب کا جامع انتخاب (1850-1100) کیا اور ریڈیو ٹیلی ویژن کے لیے مختلف موضوعات پر فیچرس لکھے، جس

نے ان کی شخصیت کو دوام بخشا۔

عرفانؔ صدیقی بنیادی طور پر ایک شاعر ہیں اور انہوں نے اس صنف کے ساتھ بھرپور انصاف کیا، یوں تو ان کے کلام کے پانچ مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں لیکن ان کی شخصیت اور عظمت کو زندہ رکھنے کے لیے صرف یہی شعر کافی ہے ۔

کوئی سلطان نہیں میرے سوا میرا شریک
مسند خاک پر بیٹھا ہوں برابر اپنے

ان کی شخصیت سے منسوب پانچ شعری مجموعوں کا ذکر کرنا تو محض ایک ادبی فریضہ ہے، ان کے شعری مجموعے مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔''کینوس'' (۱۹۷۸) ،2۔'' شب درمیان'' (۱۹۸۴)،3۔''سات سماوات'' (۱۹۹۲)،4 ۔''عشق نامہ'' (۱۹۹۷)،5۔''ہوائے دشت ماریہ'' (۱۹۹۸) ، اور6۔''کلیات دریا''(۱۹۹۹،لاہور)۔

ان کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے حکومت اتر پردیش اور مرکزی حکومت نے مختلف اعزازات سے نوازا۔'میرا کادمی' لکھنؤ کی جانب سے''نشان امتیاز میر''، بھارتیہ فن کار سوسائٹی لکھنؤ کی جانب سے'' آنند نارائن ملا''ایوارڈ اور اردو اکادمی اتر پردیش کی جانب سے مجموعی خدمات کے سلسلے میں اکیاون ہزار (51000) روپئے کا انعام غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کی جانب سے''غالب ایوارڈ برائے شاعر''، ادارہ لوح وقلم لکھنؤ سے''اعزاز مصحفی''، علی مشن کی جانب سے''علی صدی''ایوارڈ سے بھی سرفراز کیے گئے۔

15/اپریل 2004 کو اس نابغہ روزگار اور عبقری شخصیت کا انتقال لکھنؤ میں ہوا اور 16/اپریل کو بعد نماز جمعہ ڈالی گنج لکھنؤ کے قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔

غزل کے موضوعات کے سلسلے میں ہمیں تین نظریات ملتے ہیں۔ایک نظریہ یہ ہے کہ غزل کا موضوع کوئی ہوتا نہیں۔دوسرے وہ لوگ ہیں جو غزل کا موضوع محض عشق ومحبت کو مانتے

ہیں۔اس میں بھی دو طرح کے لوگ ہیں۔ایک محض جنسی محبت کو محبت مانتے ہیں دوسرے لوگوں کے لیے اس کا دائرہ کافی وسیع ہے اور وہ لوگ عشق حقیقی کو بھی اس میں شامل سمجھتے ہیں۔تیسرا نظریہ ہے کہ غزل کو کچھ خاص موضوعات کے حصار میں محدود نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس میں ہر طرح کے مضامین شامل کیے جا سکتے ہیں۔غزل کے کچھ نقاد مانتے ہیں کہ غزل کا کردار غیر موضوعی ہے یعنی جس طرح دوسری اصناف کو ہم کچھ خاص موضوعات سے پہچانتے ہیں اسی طرح غزل کو کسی خاص موضوع کا پابند نہیں کہہ سکتے۔غزل کا کوئی واضح اور طے شدہ موضوع نہیں ہوتا۔

عرفان صدیقی نے اپنی شاعری میں جن موضوعات کو پرویا ہے وہ اس لیے اہم نہیں ہیں کہ انہیں عرفان صدیقی نے موضوع بنایا ہے بلکہ دوسرے لوگ بھی ان موضوعات کو شعری پیکر عطا کر رہے تھے لیکن اس کی اہمیت اس لیے ہے کہ انہیں عرفان صدیقی نے جس شعری اسلوب میں ڈھالا ہے وہ نہایت تازہ کار اور نیا تھا۔ان کی غزلوں میں غم دوراں بھی ہے اور غم جاناں بھی اور ان کے حوالے سے عصری حسیت اور عشق کے مختلف کیفیات اور پہلو پر انہوں نے معنیٰ کی نئی طرفیں نکالی ہیں۔ہماری شاعری میں محبوب کے سراپے کا ذکر کوئی نئی بات نہیں میر نے کہا تھا۔

سراپا پہ جس جا نظر کیجئے
وہیں عمر ساری بسر کیجئے

ہاں شاعری بالخصوص غزل میں Eroticism کے اظہار کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں ،یوں بھی یہ راستہ خطروں سے خالی نہیں، زبان و بیان کی ذرا سی لغزش ہوئی نہیں کہ شاعر رکاکت کی حدوں میں داخل ہو جاتا ہے۔تلوار کی اس دھار پر غزل کی تہذیبی شائستگی کے ساتھ عرفان صدیقی جیسا قادرالکلام شاعر ہی چل سکتا تھا۔اشعار ملاحظہ ہوں۔

تجھی پہ ختم ہے جاناں مرے زوال کی رات
تو اب طلوع بھی ہو جا کہ ڈھل رہا ہوں میں

کیا ہر ن ہے کہ کبھی رم نہیں کرتا ہم سے
فاصلہ اپنا مگر کم نہیں کرتا ہم سے

میں تیری منزل جاں تک پہنچ تو سکتا ہوں
مگر یہ راہ بدن کی طرف سے آتی ہے

مگر گرفت میں آتا نہیں بدن اس کا
خیال ڈھونڈتا رہتا ہے استعارہ کوئی

روح کو روح سے ملنے نہیں دیتا ہے بدن
خیر،یہ بیچ کی دیوار گرا چاہتی ہے

بتان شہر سے یہ دل توزندہ ہو نہیں سکتا
بہت ہوگا تو میری خواہش بیدار کر دیں گے

جو رنگ خواب میں دیکھے نہیں وہ سامنے تھے
کھلا ہوا تھا نظر پہ نگار خانہ ترا

میں ایک موج میں غرقاب ہو چکا تھا مگر
چھلک رہا تھا ابھی ساغر شبانہ ترا

وہ خوش بدن ہے نوید بہار میرے لیے
میں اس کو چھو لوں تو سب کچھ نیا نیا ہو جائے

اسی رنگ کے کچھ اور اشعار ملاحظہ ہوں جن سے جسم کی آنچ کی تپش محسوس ہوتی ہے ۔عرفان صدیقی نے جس سلیقے اور فنکاری سے اس موضوع کو سوقیت سے بچایا ہے، یہ انہیں کا حصہ ہے ۔

یہ کون میرے بدن میں طلوع ہونے لگا
ابھی لہو کو ملا بھی نہیں اشارۂ شام

وہ جاگنا مری خاک بدن میں نغموں کا
کسی کی انگلیاں کانے نواز ہو جانا

خیال میں ترا کھلنا مثال بند قبا
مگر گرفت میں آنا تو راز ہو جانا

مرے وجود کا جنگل ہرا بھرا ہو جائے
وہ رت بھی آئے کہ اس کا بدن گھٹا ہو جائے

جسم سے روح تلک راہ نوردی کے لیے
ہو عنایت میرے ہونٹوں کو بھی پروانۂ لب

مذکورہ بالا اشعار پر غور کریں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ ہر شعر میں عشق کی کیفیت بدلتی

ہوئی نظر آتی ہے۔ استعاروں نے عشق کے رنگ کو الگ الگ ڈھنگ سے باندھا ہے۔ لفظوں کے در و بست نے اشعار کو معنیاتی سطح پر بلند کر دیا ہے۔ ان کے اشعار میں کہیں کہیں ایسے لطیف اشارے بھی موجود ہیں جن سے جسم و جاں یا گوشت پوشت کے ڈھانچے کی طرف کچھ مخاطبت کا پہلو نظر آتا ہے۔ کبھی کبھی تو یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ اس مخاطبت میں ایک خاص قسم کی جنسی لپک بھی موجود ہے۔ اسی نوع کی شاعری کو لذتیت کے زمرے میں شامل کیا گیا ہے۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی اسی حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''ان کی اب تک کی غزلوں پر سرسری نظر ڈالی جائے تو یہ اندازہ لگانے میں دقت نہیں ہوتی کہ شاعر نے غزل کی فارسی آور اردو روایت میں شامل ان تمام سرچشموں سے استفادہ کیا ہے جن کے ایجاز اور جامعیت نے غزل کو محض دو مصرعوں میں رمزیت، ارتکاز اور سلیقۂ اظہار کو سمیٹ لیا ہے''۔1

مندرجہ بالا اشعار میں جہاں ایک طرف اردو شاعری کی تاریخ و تہذیب کی جھلک دکھائی دیتی ہے تو دوسری طرف ان اشعار میں لذتیت اور جنسیت کا پہلو بھی پوری طور پر نظر آتا ہے۔ عرفان صدیقی کی شاعری میں عشق کے مختلف رنگ دیکھنے کو ملتے ہیں، کبھی اس میں وفا پرستی دکھائی دیتی ہے تو کبھی ہرجائی پن کے دریچے کھلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اشعار ملاحظہ ہوں ۔

تمام تاب و تب عاشقی بہانہ تیرا
بدن کسی کا بھی ہو وصل جاودانہ تیرا

ترے سوا کوئی کیسے دکھائی دے مجھ کو
کہ میری آنکھوں پہ ہے دست غائبانہ ترا

وہ ایک خواب سہی سایۂ سراب سہی
یہ عمر بھر کی تھکن ایک شجر کے نام تمام

مذکورہ بالا پہلے شعر میں ہرجائی پن کی جھلک صاف نظر آتی ہے،اور دوسرا و تیسرا شعر وفا پرستی کے بام عروج پر دال ہے۔عرفانؔ صدیقی کی شاعری میں جہاں ایک جانب اردو شاعری کی تہذیب اور شائستگی دکھائی دیتی ہے تو دوسری طرف ہندی شاعری کی جھلک بھی نظر آتی ہے ۔اردو شاعری میں محبوب کی صنف کا تعین نہیں ہوتا بلکہ اس کی جنس مخفی اور مبہم ہوتی ہے لیکن عرفانؔ صدیقی نے اپنی شاعری میں کہیں کہیں اردو غزل کی روایت کے علی الرغم محبوب کی جنس کو پورے طور پر واضح کر دیا ہے۔نمونہ کلام مندرجہ ذیل ہیں ۔

کاسۂ لب میں کہاں ڈھونڈ رہی ہو اس کو
ہم نے آنکھوں میں چھپا رکھا ہے دردانۂ لب

اس کو رہتا ہے ہمیشہ مری وحشت کا خیال
میرے گم گشتہ غزالوں کا پتہ چاہتی ہے

مندرجہ بالا اشعار میں رہی ہو، پتہ چاہتی ہے جیسے الفاظ سے محبوب کی جنس صاف طور پر عیاں ہو جاتی ہے جو اردو شاعری میں نایاب نہیں لیکن کمیاب ضرور ہے۔عرفانؔ صدیقی کی غزلیہ شاعری میں ایک نادر مثال اور دیکھنے کو ملتی ہے اور وہ ہے محبوب کا خود عشق میں گرفتار ہونا۔مثال کے طور پر یہ شعر ملاحظہ ہو ۔

ہم سے وہ جان سخن ربت نوا چاہتی ہے
چاند ہے اور چراغوں سے ضیا چاہتی ہے

مذکورہ شعر پر غور کرنے پر ہمارے سامنے ایک نیا دریچہ وا ہوتا ہے جس کو عرفان صدیقی نے اپنی شاعری میں برتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ان کا محبوب خود بھی عشق میں گرفتار ہے۔دیگر

شعراء کی طرح عرفانؔ صدیقی نے بھی اپنی شاعری میں عشق کی تہذیب کو بڑی ہی معصومیت سے پیش کیا ہے۔اشعار ملاحظہ ہو ؎

ہوا گلاب کو چھو کر گزرتی رہتی ہے
سو میں بھی اتنا گنہگار رہنا چاہتا ہوں

میرے ہونے میں کسی طور سے شامل ہوجاؤ
تم مسیحا نہیں ہوتے تو قاتل ہوجاؤ

ہمیں تو خیر بکھرنا ہی تھا کبھی نہ کبھی
ہوائے تازہ کا جھونکا بہانہ ہو گیا

مندرجہ بالا اشعار میں عشقِ صادق کا تہذیبی پہلو پوری طرح کھل کر سامنے آ گیا ہے کیوں کہ اردو شاعری کا عاشق ہمیشہ آرزو اور خواہش کے سہارے زندگی گزارتا ہے اور وہ آرزو مذکورہ اشعار میں صاف طور پر عیاں ہے۔فارسی اور اردو شاعری کا محبوب بڑا ستم پیشہ اور جفا شعار ہوتا ہے،اس کا خاص وتیرہ یہ رہا ہے کہ وہ اپنے عاشق کو ہمیشہ پریشانیوں میں مبتلا رکھتا ہے اور اس سے لطف اندوز ہوتا ہے،وہ عنایت بھی کرتا ہے تو اس میں عتاب کا رنگ شامل ہوتا ہے۔اس مسئلہ کو بھی عرفانؔ صدیقی نے اپنی شاعری میں بہت خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔اشعار ملاحظہ ہو ؎

اس کے لہجے میں کوئی چیز تو شامل تھی کہ آج
دل پہ اس حرف عنایت نے گراں باری کی

اس کو منظور نہیں ہے میری گمراہی بھی
اور مجھے راہ پہ لانا بھی نہیں چاہتا ہے

عرفانؔ صدیقی کے یہاں عشق کی کیفیات بت ہزار شیوہ کی طرح سامنے آتی ہے۔ بلکہ عرفانؔ صدیقی کی شاعری میں عشق ذات اور کائنات کے حوالے سے بھی اپنا تعارف کراتا ہے اور عام تجربات کی کسوٹی پر بھی کھرا اترتا دکھائی دیتا ہے مگر زندگی کی اس دھوپ چھاؤں میں عرفان کے تصور عشق کے بھی کئی رنگ ہیں اور کئی روپ، مگر سارے رنگ جس مجموعی تصویر کی تعمیر کرتے ہیں وہ حد درجہ جاذب نظر ہونے کے باوجود بھی کائناتی بھول بھلیوں کا حصہ نہیں بنتی بلکہ زندگی اور وجود کو نئے جہان معنی سے متعارف کراتی ہے۔

اپنے کس کام میں لائے گا بتاتا بھی نہیں
ہم کو اوروں پہ گنوانا بھی نہیں چاہتا ہے

دیکھتے ہیں تو لہو جیسے رگیں توڑتا ہے
ہم تو مرجائیں گے سینے سے لگا کر اس کو

اس کی آنکھیں ہیں کہ اک ڈوبنے والا انسان
دوسرے ڈوبنے والے کو پکارے جیسے

شعلۂ عشق بجھانا بھی نہیں چاہتا ہے
وہ مگر خود کو جلانا بھی نہیں چاہتا ہے

عرفانؔ صدیقی کے یہاں عشق ایک ایسا جذبہ ہے جو کئی جذبوں کا مرکب ہے اس میں تکلف بھی ہے، جذباتی کیفیات بھی ہیں، فریب خوردگی بھی ہے، اور فریب دہی بھی، الغرض کئی رنگ ہیں، کئی جذبے ہیں، کئی روپ ہیں جو عرفانؔ کے جذبۂ عشق کی تعمیر کرتے ہیں۔ مگر شاہراہ اعتدال کو عرفانؔ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

عرفانؔ صدیقی اس بات سے باخبر ہیں کہ کوئی بھی جذبہ دائمی نہیں ہوتا، نہ ہمیشہ کے لیے ٹھہرتا ہے اور نہ ہی ہمیشہ کے لیے رخصت ہوتا ہے بلکہ مختلف اوقات میں مختلف تجربات کا سامنا ہی زندگی سے عبارت ہے۔ ایک ہی شخص ایک وقت میں بہت مخلص ہوتا ہے جب کہ کسی دوسرے وقت میں اس سے نفاق کی بو آتی ہے، کسی اور وقت میں وہ ظالم کا روپ دھارن کر لیتا ہے پھر کسی وقت وہ حد درجہ مہربان اور شفیق دکھائی دیتا ہے۔ کسی بھی جذبے کو بنیاد بنا کر کسی شخص کے تعلق سے کوئی رائے قائم کرنا نفسیات انسانی سے واقفیت کی دلیل ہے۔ یہاں یہ الگ بات ہے کہ کچھ جذبے بذات خود تو عارضی ہوتے ہیں مگر ایسے فیصلہ کن نتائج کا اعلان کر جاتے ہیں جن کے اثرات دیرپا ہوتے ہیں۔ اور پھر کسی بھی طرح ان کی بھرپائی نہیں ہو پاتی۔

عرفانؔ صدیقی کی عشقیہ شاعری کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں اردو شاعری کے ان تمام تر مضامین کو بڑی ہی فنّی چابکدستی کے ساتھ پیش کیا ہے جو اردو غزل کا خاصہ رہے ہیں۔ مختصر یہ کہ ''عشق نامہ'' عرفانؔ صدیقی کے دیگر تمام شعری مجموعوں سے بہ اعتبار کیفیت و کمیت مختلف ہے اور اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ عرفانؔ صدیقی نے کلاسیکی شعری روایات اور جدید ترین آہنگ شاعری کے امتزاج سے ایک نئی شعری ''بوطیقا'' مرتب کر دی ہے جو صدیوں تک اس عظیم اور طبع زاد شاعر کی یاد دلاتی رہے گی۔